بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دورِ جدید میں مادہ پرستانہ فلسفۂ حیات نے لوگوں کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو جس انداز سے بدلا ہے اس سے نہ صرف بعض الفاظ اور محاورات کے مفہوم بدل گئے ہیں بلکہ ان کی اہمیت کے مدارج اور ان کے مطالب و معانی کے دائروں میں بھی اچھا خاصہ تغیر رونما ہوا ہے۔ چنانچہ روزمرہ کے وہ الفاظ جو اپنے اندر کوئی خاص معنویت نہ رکھتے تھے وہ اب اس بنا پر اصطلاحات کا روپ دھارنے لگے ہیں کہ ان میں مادی فلسفۂ حیات کی روح کارفرما نظر آتی ہے، یا اُن الفاظ کی اہمیت بڑھنے لگی ہے جو کسی اعتبار سے مادی اندازِ فکر کے ترجمان دکھائی دیتے ہیں، یا عام الفاظ میں بالکل مصنوعی طریق سے مادیت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہمارے اس دور میں وہ الفاظ جنہیں مادی نقطۂ نظر کی وجہ سے اصطلاحات کا درجہ حاصل ہوا ہے ان میں سماج، طبقہ، کشمکش، حقوق، محنت کش، سرمایہ داری اور اسی نوع کے دیگر الفاظ شامل ہیں۔ دوسرے زمرے میں تجربہ، مشاہدہ، عقل، آفاقی جیسے متعدد الفاظ آتے ہیں۔ وہ الفاظ جنہیں کھینچ تان کر مادی اندازِ فکر کا ترجمان بنایا جارہا ہے ان کی فہرست سب سے طویل ہے۔ ظلم، استبداد، مساوات، استحصال اور اسی نوع کے لاتعداد الفاظ ایسے ہیں جن کے سُنتے ہی انسان کے ذہن میں مادی تصورات گھومنے لگتے ہیں۔ مثلاً آج ہم جب لفظ "ظلم" سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہی ایک خیال اُبھرتا ہے کہ کسی فرد یا گروہ کے ساتھ تقسیمِ دولت کے معاملہ میں ظلم ہو رہا ہے، درآنحالیکہ ظلم کی بے شمار صورتیں ہیں اور وہ اس معاشی ظلم سے کہیں زیادہ روح فرسا ہوتی ہیں۔ مادی افکار کی یلغار نے ان الفاظ کا اس طرح حلیہ بگاڑا ہے کہ بسا اوقات خالص روحانی اور پاکیزہ اصطلاحات بھی صرف معیشت اور مادیت کی شارح و ترجمان نظر آتی ہیں۔ مثلاً آپ "مساواتِ محمدیؐ" کے نعرہ کو لیں اور دیانتداری سے غور کریں کہ کیا اس نعرہ کو سُن کر انسان کے ذہن میں صرف یہی ایک تصور نہیں اُبھرتا کہ کسی معاشرہ میں معاشی اعتبار سے جو اُونچ نیچ پائی جاتی ہے، وہ ختم ہو اور مساواتِ شکم کی بنیاد پر اس معاشرے کی تعمیرِ نو

کی جائے ؟ انسانوں کے مابین مساویانہ اور عادلانہ برتاؤ صرف زندگی کے ایک شعبہ ہی میں درکار نہیں ہوتا بلکہ انسان زندگی کے ہر شعبہ میں اِس سلوک کا اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہے لیکن ماہرینِ فن نے اس اصطلاح میں مادیت کے ایسے شوخ رنگ بھر دیے ہیں کہ ایک انسان کو یہ اصطلاح "مساواتِ شکم" کے ہم معنی دکھائی دیتی ہے۔

اِسی طرح آپ "نظام ربوبیت" پر غور کریں۔ یہ اصطلاح اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک دینی اصطلاح ہے اور اسے سُن کر کسی سلیم الفطرت انسان کے ذہن میں اسلامی نظام کا نقش ہی اجاگر ہوتا ہے کیونکہ کائنات کے خالق نے انسان کی ساری احتیاجات کا بطریقِ اَحسن انتظام کر رکھا ہے۔ اُس ذات نے ایک طرف اگر انسان کی مادی احتیاجات کی تسکین کے لیے ذرائع و وسائل مہیا کیے اور ضابطے مقرر فرمائے ہیں تو دوسری طرف انسان کی روحانی پیاس بُجھانے اور اُس کے اخلاقی احساسات کو زندہ رکھنے کا بھی پورا پورا التزام کیا ہے لیکن مادی فلسفۂ حیات خصوصاً اشتراکیت کے زیر اثر اس مقدس اصطلاح کو اس طرح بگاڑا گیا ہے کہ اسے سُنتے ہی انسان کے ذہن میں ایک ایسے نظام کا تصور آتا ہے جس میں انسانوں کا ایک محدود و ساگروہ مرکزِ ملت کے نام پر نہ صرف کسی ملک کے وسائلِ رزق پر قابض ہو، بلکہ اس کے سیاہ و سفید کا بھی پوری طرح مالک ہو اور پھر وہ اپنی صوابدید کے مطابق عوام کو روٹی کے نوالے تقسیم کرے۔ کیا اس اصطلاح کے پردے میں اشتمالیت کا پرچار نہیں کیا جا رہا ؟ یہ اصطلاح جب جدید مفہوم کے ساتھ سامنے آتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے غالباً وضع ہی اس غرض کے لیے کیا گیا ہے کہ دنیا کو یہ باور کرایا جائے کہ کسی ملک کے وسائلِ معیشت پر حکومت کی مکمل اجارہ داری صرف اشتراکیت کا ہی طغرہ امتیاز نہیں بلکہ اسلام بھی اسی قسم کے جابرانہ نظام کا علمبردار ہے۔

ان اصطلاحات کے علاوہ بعض الفاظ کو مادیت کے پسِ منظر میں رکھ کر ایسے نئے مفاہیم کے ساتھ سامنے لایا جا رہا ہے کہ ان کے اور مادی پس منظر کے مابین پوری طرح مطابقت نظر آئے۔ اِس نوعیت کی علمی عیاری کی یوں تو متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر ان صفحات میں ہم صرف ایک لفظ "تجربہ" کو لیتے ہیں۔ یہ لفظ بظاہر کس قدر سادہ اور مفہوم کے لحاظ سے کس قدر آسان ہے لیکن مادی فلسفۂ حیات نے اس لفظ کے مفہوم اور مدعا کو جس انداز سے تبدیل کیا ہے اور پھر اس معصوم سے لفظ کی آڑ میں انسانیت کو جن ہولناکیوں سے دوچار کیا ہے

اس کے تصور سے انسانی رُوح لرز جاتی ہے۔

لفظ تجربہ جب کسی شخص کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو یہی ایک مفہوم سامنے آتا ہے کہ کوئی ایسا کام جس سے کسی چیز کی ماہیت، یا اس کا اصول یا اثر معلوم کیا جا سکے یا کسی شے کی آزمائش، جانچ اور پرکھ کرنے کا طریقہ۔ اس لفظ کو دورِ جدید سے پہلے کبھی وحی کا نقیض تصور نہیں کیا گیا تھا بلکہ اسے وحی کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات کی صحت منکرینِ وحی پر ثابت کرنے کا مؤثر طریقہ سمجھا گیا ہے مگر آج مادیت کے علمبردار دانشوروں کی کاوشوں کی وجہ سے یہ لفظ وحی اور الہام کی ضد بن کر رہ گیا ہے اور انسان اس نہج پر سوچنے لگا ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ ہی علمِ حقیقی کی اساس ہیں اور جو معلومات تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ انسان کو حاصل نہ ہوں وہ محض اوہام ہیں۔

آگے بڑھنے سے پیشتر اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ آخر اس لفظ کو آجکل کے مادی دور میں غیر معمولی اہمیت کیوں حاصل ہوئی ہے۔ یوں تو اس کے متعدد وجوہ ہیں جن میں بعض تاریخی عوامل بھی شامل ہیں لیکن اس ضمن میں دو وجوہ خاص طور پر نمایاں ہیں۔

انسان اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے اعتبار سے ایک محدود اور حقیر سی ہستی ہے لیکن اس کے اندر جو امنگیں اُبھرتی ہیں وہ لامحدود ہوتی ہیں اور ان کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ انسان محدود قوتوں اور محدود ذرائع کے باوجود لامحدود کو سمجھنے اور اس سے تعلقِ خاطر پیدا کرنے کی شدید آرزو رکھتا ہے۔ اس کی اس بے بسی کو قدرت نے وحی کے ذریعہ دور کیا ہے تاکہ وہ اپنی ساری حد بندیوں اور مجبوریوں کے علی الرغم ایک ایسی راہ پر گامزن ہو سکے جس سے اسے نہ صرف لامحدود کا شعور حاصل ہو بلکہ اس کے ساتھ رشتہ عبودیت بھی استوار کر سکے۔

قدرت کی یہ معاونت صرف فکر و جذبہ تک ہی محدود نہیں بلکہ اس نے زندگی کے عملی میدان میں بھی انسان کی اس احتیاج کو بطریقِ احسن پورا کیا ہے۔ جس خالق نے انسان کی تخلیق کی ہے اسے اپنی اس مخلوق کی فطری حد بندیوں اور مجبوریوں کا پورا علم ہے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ اگر انسان کو زندگی کی اس رزم گاہ میں

صرف عقل کے سہارے پر چھوڑ دیا جائے تو اسے زندہ رہنے کے لیے کیا کیا دشواریاں اور مشکلات پیش آئیں گی اور اس کی زندگی کس خوفناک عذاب کی صورت میں اُس پر مسلط ہوگی ۔ اس بنا پر اُس ذات نے نبوت کی شکل میں انسان کو ایک ایسی روشنی عطا کی ہے جو اسے نہ صرف تاریکی میں بھٹکنے اور اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ حق و صداقت کی صاف اور روشن راہ پر گامزن رہنے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اپنے مخصوص بلیغانہ انداز میں نبوت کو رحمتِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے ۔ اس کی ایک وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اُس ذات نے اپنے خاص مصالح کے تحت انسان کو علم کے جو مختلف ذرائع عطا کیے ہیں وہ چونکہ محدود ہونے کی وجہ سے اشیاء اور اعمال کے روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتے اس لیے انسان کی اس فطری کمزوری کو وحی کے ذریعے دُور کیا گیا ہے تاکہ اسے کسی نظریہ یا عمل کی صحت جانچنے کے لیے ہولناک تجربات سے گذرنا نہ پڑے بلکہ وحی اس کی ہر قدم پر رہنمائی کرے ۔ دورِ حاضر کے ایک نامور مفکر نے وحی کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس ذریعہ علم کو "انسانی تجربہ کی کفایت" سے تعبیر کیا ہے ۔

اب اگر کوئی فلسفۂ حیات اپنے سامنے یہ مقصد رکھتا ہے کہ انسان کو وحی سے بدظن کیا جائے تو اس کی سب سے زیادہ آسان صورت یہ ہے کہ وحی کے مقابلہ میں تجربہ اور مشاہدہ کی اہمیت کو غیر معمولی طور پر بڑھا یا جائے اور اس کے ذہن میں یہ باطل خیال راسخ کیا جائے کہ جس چیز کی تائید تجربہ سے نہیں ہوتی وہ باطل ہے کیونکہ اگر وہ صحیح ہے تو اُس کی تائید تجربہ سے ہر حال میں ہونی چاہیے ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نوعِ انسانی کی سیاہ بختی کا آغاز ہوتا ہے ۔ تجربہ کی بنیاد حواسِ خمسہ پر ہے اور انسان کے یہ حواس اشیاء اور اعمال کے صرف مادی خواص کا ہی کسی قدر اندازہ کر سکتے ہیں اس لیے تجربہ سے انسان کو جو معلومات حاصل ہیں وہ مادی اعتبار سے خواہ کتنی ہی مفید اور نتیجہ خیز ہوں مگر روحانی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے کسی قدر و قیمت کی حامل نہیں ہو سکتیں ۔ انسان کا جسم بلاشبہ بعض مادی عناصر سے عبارت ہے لیکن اس میں انسانیت کا اصل جوہر جس کی بنا پر اسے "اشرف المخلوقات" قرار دیا گیا ہے وہ اس کا روحانی احساس ہے ۔ چنانچہ جب ہم تجربہ کو انسانی علم کی واحد بنیاد قرار دیتے ہیں تو ہم درحقیقت اس کے اخلاقی اور روحانی جوہر کا ابطال کرتے ہیں اور اس کے بارے میں یہ غلط نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ کائنات کی مادی قوتوں کے ہاتھ میں بے بس کھلونا ہے یا زیادہ صحیح الفاظ میں معاشی قوتیں ہی اس کے فکر و احساس کا ہیولیٰ تیار کرتی ہیں ۔ تجربہ چونکہ وحی و الہام اور انسان کے اخلاقی اور روحانی احساس کی نفی

کے لیے ایک کارگر ہتھیار کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے، اس لیے مادی فلسفۂ حیات کے پرستاروں نے اس لفظ کو خوب اچھالا ہے اور ایک مخصوص دائرے اور خاص حد کے اندر جو عمل خاصا مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتا تھا اُسے اُس کی فطری حدود سے نکال کر انسانیت کی تباہی کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔

انسان کی اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے زندگی کے سارے دائروں میں ایک ایسے ہتھیار سے کام لینے پر مجبور کیا جائے جو اس کے لیے کسی ایک شعبہ میں بھی پوری طرح کارگر ثابت نہیں ہو سکتا لیکن اس ہتھیار کے بے محابہ استعمال نے زندگی کے اندر جس قسم کی پیچیدگیاں پیدا کی ہیں اُن کا اندازہ مندرجہ ذیل مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔

حیاتِ انسانی کا وہ گوشہ جس میں تجربہ کا ہتھیار سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے وہ پیدائشِ دولت کا شعبہ ہے کیونکہ اس ہتھیار کی مدد سے ہی انسان طریقِ پیدائش کی نئی نئی گرہیں کھولنے میں کامیاب ہوا ہے اور جس کے نتیجے میں کثیر پیداواری اور زود پیداواری ممکن ہوئی ہے مگر انسان کی اس محیر العقول کامیابی نے اُس کے لیے ایسے لاینحل مسائل پیدا کر دیے ہیں جس نے اس کی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ اسی افراتشِ دولت کا نتیجہ ہے کہ صنعتی اعتبار سے طاقتور قوموں نے کمزور ممالک کو غلام بنا کر نہ صرف ان کے باشندوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں بلکہ ان کے وسائل کو بھی بے دریغ لوٹا ہے۔ پھر دولت پرستی کے اس جنون نے جارحانہ قوم پرستی، نسل پرستی، آمریت، اشتراکیت اور اشتمالیت جیسے ظالمانہ نظاموں کو انسانوں پر مسلط کر کے ان کی انسانیت کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے، الفاظ کا کوئی ڈھانچہ اس دردناک حزنیہ کے اظہار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ اسی غلط نظریات کے تلخ ثمرات ہیں کہ انسان دور دراز فاصلوں کے سمٹ جانے کے باوجود نہ صرف ایک دوسرے سے بُعد و بیگانگی رکھتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں۔ انسان کو مال و دولت کی جو فراوانی نصیب ہوئی ہے اُس کے پیشِ نظر اس بات کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ دولت کی یہ ریل پیل اُس کے لیے بہتر اور شاد کام زندگی کی ضمانت ثابت ہوگی مگر یہ اُلٹی اُس کے لیے ان گنت اور ناقابلِ برداشت مصائب کا باعث بن گئی ہے۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ جس تجربہ سے انسان نے افراتشِ دولت کے ڈھنگ سیکھے ہیں وہ اُس کی اخلاقی اور روحانی نشوونما کرنے میں ناکام رہا ہے۔ پھر اس معاملہ میں اس کی بے بسی اور مجبوری بھی ظاہر ہے تجربہ کی جو لانگاہ صرف مادی دنیا ہے اور جو چیز اس دائرے میں نہیں آتی وہ تجربہ کی دسترس سے بھی باہر ہے

اور اگر اس معاملہ میں اُس پر انحصار کیا جائے تو انسان کی تباہی یقینی ہے۔ بقول ابن خلدون جو ترازو سونا تولنے کے لیے بنایا گیا ہے اسے اگر پہاڑوں کو تولنے کے لیے استعمال کیا جائے تو اس ترازو اور ان غلط عزائم کے حامل لوگوں کا جو حشر ہوگا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

"تجربہ" پر بے جا اعتماد کا دوسرا خوفناک پہلو جو انسانیت کے لیے مندرجہ بالا پہلو سے بھی کہیں زیادہ المناک اور تباہ کن ثابت ہوا ہے وہ معاشرتی زندگی میں اس کی عملداری ہے۔ دورِ جدید کا سائنسدان اپنی تجربہ گاہ میں اس بات کا پورا التزام کرتا ہے کہ کوئی جاندار شے تو کجا کسی بے جان شے کا بھی زیاں نہ ہو۔ وہ کم سے کم اشیاء کے استعمال سے بہتر سے بہتر نتائج حاصل کرنے کی تدابیر سوچتا ہے تاکہ اس کی محنت پوری طرح بارآور ہو۔ پھر اگر وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ کسی جاندار پر تجربہ کیے بغیر وہ کوئی مفید نتائج اخذ نہیں کر سکتا تو وہ حقیر سے جانوروں پر تجربات کرتا ہے لیکن اپنے کسی تجربہ کے لیے انسان پر مشقِ ناز کرنے سے حتی المقدور گریز کرتا ہے۔ اسے جب دوسرے تمام ذرائع سے اپنے تجربے کی صحت کے بارے میں مکمل اطمینان ہو جاتا ہے اور وہ اس بات کا یقین کر لیتا ہے کہ اُسے اِس تجربے کی وساطت سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ انسان کے لیے کسی لحاظ سے مہلک ثابت نہ ہوں گی، اُس وقت وہ اپنی اِن تحقیقات کے نتائج سے انسانوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ بہرہ ور کرتا ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ تجربات کا دلدادہ انسان جب علوم طبیعی کے معمل سے نکل کر زندگی کی معاشرتی، سیاسی اور معاشی تجربہ گاہوں میں سرگرم عمل ہوتا ہے تو نوعِ بشری کے بارے میں اس حزم و احتیاط کو یکسر نظر انداز کر کے ایسا عاجلانہ اور غیر ذمہ دارانہ بلکہ انسانیت کش رویہ اختیار کرتا ہے جس سے نسلِ انسانی نہایت خوفناک قسم کی ہلاکت خیزیوں سے دوچار ہوتی ہے۔ عقل و دانش کے یہ جان نثار فہم و فراست کے اُونچے دعووں کے باوجود ابھی تک اس حقیقت کو سمجھ نہیں پائے کہ معاشرتی زندگی کے تجربات بڑے طویل اور صبر آزما ہوتے ہیں اور یہ تجربات اگر ناکام ہو جائیں تو انسانیت پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ان تجربات کی آزمائش میں نہیں ڈالا۔ ہم یہاں اپنی بات کی وضاحت دو تین مثالوں سے کرتے ہیں۔

آپ ایک ثانیہ کے لیے معاشرتی تجربات کے اثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اُن طبی اور سائنسی

تجربات کی ناکامیوں کے بے پناہ نقصانات پر غور کریں جن سے انسان کسی نہ کسی صورت میں متاثر ہوتا ہے اور پھر اس امر کا اندازہ لگائیں کہ ایک معمولی لغزش انسانیت کے لیے کس حد تک تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ ابھی حال ہی میں پاکستان کے اندر ادویہ کے نوعی اسماء کا تجربہ ناکام ہوا ہے۔ یہ تجربہ اگرچہ انسانی زندگی کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن اُسے صحیح معنوں میں کوئی معاشرتی تجربہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا تعلق علم کے اُس شعبے سے ہے جس کے نتائج ظاہر ہونے میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگتی اور جو معاشرے کے ہر فرد کو بیک وقت اپنی لپیٹ میں نہیں لیتا لیکن اس کے باوجود اس تجربے کی ناکامی سے نہ صرف کروڑوں روپے کا نقصان ہوا ہے بلکہ لاکھوں انسانوں کے لیے کسی نہ کسی صورت میں ضرر رساں ثابت ہوا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ اس سے ہزاروں جانیں بھی ضائع ہوئی ہیں تو یہ کسی طرح بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

اگر صرف ایک ملک کے شعبہ طب کا ایک معمولی سا تجربہ ناکام ہو کر اس ملک کے باشندوں کے لیے بہت بڑی بربادی کا باعث بن سکتا ہے تو معاشرتی تجربات جن کے نتائج صدیوں کے بعد کھل کر سامنے آتے ہیں اور جن سے معاشرے کے ہر فرد کی زندگی متاثر ہوتی ہے، ان کی تباہ کاریوں کا کس طرح صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ مثال کے طور پر قومی ملکیت کے تجربے کو ہی لیجیے۔ معاشرتی زندگی اور اس کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے بعض مفکرین نے بے کسوں کو استحصال سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ فلسفہ پیش کیا کہ کسی معاشرہ میں فساد کی جڑ نجی ملکیت کا وجود ہے اس لیے اس برائی کو مٹانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ملک کی ساری املاک اور تمام وسائل رزق حکومت کی تحویل میں دے دیے جائیں اور اسے یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ جس طرح چاہے عوام کو زندہ رکھنے کا سامان کرے۔ چنانچہ اس فلسفہ کی عملی افادیت اور قومی ملکیت کی محسوس برکات کا اندازہ کرنے کے لیے روس سے اس تجربے کا آغاز کیا گیا۔ ظاہر ہے یہ ملک دوسرے ممالک کی طرح ایسے انسانوں سے آباد تھا جو اپنے مخصوص عقائد اور افکار رکھتے تھے، جن کے دنیوی اور اُخروی زندگی کے بارے میں خاص نظریات تھے، جن کی روایات اُن کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئی تھیں اور جو ان عقائد اور روایات کے زیر اثر ملکیت کے بارے میں اپنے ایک الگ نقطہ نظر اور احساس کے حامل تھے۔ اس بنا پر روس کو اشتراکیت کی تجربہ گاہ بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اِس کے لیے بڑے وسیع پیمانے پر توڑ پھوڑ اور شدید نوعیت کے جبر و استبداد کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اشتراکیت کے علمبرداروں نے لاکھوں افراد کے قتل، اور کروڑوں (باقی بر صفحہ ۴۶)

(بقیہ اشارات) بے گناہ انسانوں کو بھیانک مظالم کا نشانہ ستم بنانے کے بعد اس نظام کو روس کے اندر مسلط کیا اگرچہ اب بھی وہاں بقول مارکس کے سچے پرستاروں کے حقیقی اشتراکیت موجود نہیں بلکہ بعض کے نزدیک جن میں چین کے اشتراکی پیش پیش ہیں، سامراجی نظام اپنی ساری قہرمانیوں کے ساتھ پروان چڑھا ہے لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ روس کو اشتراکی تجربہ گاہ کی حیثیت سے اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ اس تجربے کی کامیابیوں کے افسانے جب ہم خود اشتراکیوں کی زبان سے سنتے ہیں تو ہمارے سامنے لے دے کر صرف یہی چند پہلو نمایاں ہو کر آتے ہیں کہ وہاں عوام کا معیار زندگی کسی حد تک بلند ہو گیا ہے گو وہ بعض سرمایہ دارانہ ممالک سے ابھی کافی پست ہے یا وہاں لوگوں کو کسی قدر معاشی تحفظ حاصل ہوا ہے یا یہ ملک جنگی نقطہ نظر سے امریکہ کا کامیاب حریف ثابت ہو سکتا ہے یا سائنس اور صنعتیات میں یہاں کافی ترقی ہوئی ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح اور درست ہی سہی لیکن یہ دیکھیے کہ اس معاشرتی تجربہ میں انسانیت کو کتنا عظیم نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔

نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے لیکن ابھی یہ تجربہ بالکل اپنے ابتدائی مراحل میں ہے کیونکہ جن فوائد کے حصول کی خاطر اسے شروع کیا گیا تھا ان میں سے اس وقت تک کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوا۔ روسی تجربہ گاہ میں نہ تو ریاست کا وجود ختم ہوا ہے اور نہ استحصال و استبداد کی بیخ کنی ہوئی ہے۔ معاشرے میں طبقاتی تقسیم کے وہی روح فرسا مناظر سامنے آ رہے ہیں جو بالعموم غیر اشتراکی ممالک میں دیکھے جاتے ہیں۔ جہاں تک اس کی خارجی پالیسی کا تعلق ہے اُس میں بھی ہر قدم پر ناپاک سامراجی عزائم ہی جھلکتے ہیں۔ پھر جو ممالک آزادی اور اجتماعی عدل کے اس علمبردار کے زیر اثر آئے ہیں اُن کا جو حشر ہوا ہے وہ کسی اعتبار سے بھی اس حشر سے مختلف نہیں جو استعماری ممالک نے اپنی نوآبادیوں کے ساتھ کیا ہے۔ روس کے اندر اس اشتراکی تجربے کی رفتار، نہج اور اس کے نتائج دیکھ کر یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ یہ تجربہ طویل تو ضرور ہوگا اور بعض سرپھرے اسے دوسرے ممالک میں بھی دہرانے کی کوشش کریں گے اور اس کی وجہ سے نوع انسانی کا ایک بہت بڑا حصہ اَن گنت مصائب میں مبتلا ہوگا لیکن جس طرح کسی انسان کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جو سورج آج غروب ہو رہا ہے وہ کل ضرور طلوع ہوگا اس سے زیادہ وثوق کے ساتھ اس اشتراکی تجربے کی ناکامی کے متعلق پیشگوئی کی جا سکتی ہے کیونکہ یہ تجربہ نہ صرف فطرتِ انسانی کے خلاف گہری سازش ہے بلکہ اس خالق کے خلاف بھی بغاوت ہے جو حیاتِ انسانی کے مسائل کو محدود عقل رکھنے والے انسانوں سے بہتر جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکیت

کی جس منزلِ مقصود کی مارکس نے نشاندہی کی تھی، اشتراکی ممالک اُس سے نزدیک تر ہونے کے بجائے دُور ہٹتے جا رہے ہیں۔ اشتراکیت اور روس کے ناقدین کی تو بات جانے دیجیے۔ اُن کے علمبرداروں اور بہی خواہوں کی اگر آرا معلوم کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس تجربے کی کامرانیاں صرف زیبِ داستان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ روس کے عوام اِس تجربہ کی چکی میں بُری طرح پِسنے کے بعد اُسی طرح مفلوک الحال ہیں جس طرح کہ غیر اشتراکی ممالک کے ستم زدہ لوگ۔ باقی جہاں تک "برق و بخارات" کے معاملے میں روس کی ترقی کا چرچا کر کے اسے اشتراکی نظام کی کامیابی کی دلیل ٹھہرایا جاتا ہے تو یہ سراسر منطقی مغالطہ ہے۔ اگر روس کی یہ سائنسی ترقی محض اشتراکیت کی رہینِ منّت ہے تو پھر امریکہ، فرانس، برطانیہ اور جاپان جہاں سرمایہ دارانہ نظام کا تسلّط ہے وہاں جدید صنعت کا نام و نشان نہ ملنا چاہیے۔ لیکن یہ سارے ممالک صنعتیانی اعتبار سے روس کے مقابلہ میں خاصے ترقی یافتہ ہیں۔ روس کی ترقی اشتراکی نظام کی رہینِ منّت نہیں بلکہ اس جوش و ولولہ کا نتیجہ ہے جو کوئی قیادت کسی قوم کے اندر پیدا کر دیتی ہے۔ دنیا کے متعدد قائدین نے اپنے اخلاص اور حسنِ تدبّر سے کام لے کر اشتراکیت کی راہ سے نہیں بلکہ بعض دوسری راہوں سے اپنی اپنی قوموں کو بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ تاریخ کے اوراق اِس حقیقت پر شاہد ہیں کہ انسانیت کے بعض بہی خواہوں نے قوموں کی اخلاقی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اور اس بنیاد پر ہی ان کے لیے اجتماعی نظام تجویز کیے مگر اخلاقی اصلاح کے اس کام میں افراد کے اندر جو حرکت اور حرارت پیدا ہوئی اس سے نہ صرف اُن کی اخلاقی اور روحانی حالت سدھری بلکہ ایک ایسا اجتماعی ماحول بھی معرضِ وجود میں آیا جس میں ان کے لیے مادی ترقی کی تحریک پیدا ہوئی۔ اشتراکیت کے لیے آج بعض انسانوں کے دلوں میں جو کشش ہے وہ اس نظام کی وجہ سے نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام سے بیزاری کا نتیجہ ہے۔ لیکن خود اشتراکی نظام کے متعلق جو خوفناک بیزاری پیدا ہوگی اس کا مظاہرہ اس وقت ہوگا جب اشتراکیت تجربات کے سارے مراحل سے گذر کر زبانِ حال سے اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگی اور یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس کا یہ اعتراف سرمایہ دارانہ جمہوریت سے زیادہ واضح ہوگا۔

مگر سوچنے والی بات یہ ہے کہ اشتراکیت کی اس ناکامی سے یہ بات تو کھل کر سامنے آجائے گی کہ یہ نظام چونکہ غلط بنیادوں پر استوار ہوا ہے اس لیے اس کے علمبرداروں کی مجنونانہ سرگرمیوں کے باوجود یہ انسانیت کی فوز و فلاح کا ذریعہ نہیں بن سکا اور انسانوں کی عظیم اکثریت اس کڑی آزمائش سے گذرنے کے بعد بھی اسی

کس مپرسی کا شکار رہے جس کا وہ دورِ سرمایہ داری میں شکار تھی۔ لیکن کیا ان تلخ حقائق کے سامنے آجانے سے اُن بے پناہ نقصانات کی تلافی ہو سکتی ہے جو اشتراکیت کے اس تجربے کی وجہ سے انسانیت کو اُٹھانا پڑے ہیں۔ آخر اُن لاکھوں بلکہ کروڑوں بے گناہ انسانوں کا خون کن لوگوں کی گردن پر ڈالا جائے گا جو اس ناکام معاشرتی تجربے میں ہلاک ہونگے؟ کیا کسی نظام کی ناکامی کے محض اعتراف سے عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں؟

ہمارے نزدیک عہدِ حاضر کے انسان کی سب سے بڑی حرماں نصیبی یہ ہے کہ اسے معاشرتی تجربات کی بھٹیوں میں بے دریغ جھونک دیا جاتا ہے اور وہ جب جل کر بالکل راکھ ہو جاتا ہے تو پھر کیمیاگر کے سے انداز میں اپنی ناکامیوں کو چھپانے کے لیے بڑی عیاری کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ بس ایک آنچ کی کسر باقی تھی ورنہ سونا تو بنا چاہتا تھا۔ کیمیاگر کا تجربہ اگر ناکام ہوتا ہے تو یہ صرف مال و دولت کا زیاں ہے لیکن جب "معاشرہ گروں" کو اپنے تجربات میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے تو اس سے پوری انسانیت برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ دنیا پر جب تک مذہب کا تسلط قائم رہا اُس وقت تک چونکہ معاشرت کی بنیاد مضبوط اور اقدارِ حیات کی اساس مستحکم تھی اس لیے انسان کو معاشرتی تجربات کے زیادہ مواقع میسر نہ آتے تھے اور اگر یہ میسر بھی آتے تو ان کے دائرے بڑے محدود ہوتے جس سے انسانی زندگی کو کوئی شدید جھٹکا نہ لگتا۔ لیکن دورِ جدید میں مذہب کی گرفت کمزور ہونے کی وجہ سے چونکہ انسان کے فکری جہاز بے لنگر ہو گئے ہیں اس لیے افکار و نظریات کے طوفان جس طرف چاہتے ہیں اسے بہا کر لے جاتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں اسے ایک دوسرے سے ٹکرا کر غرق کر دیتے ہیں۔

قرآنِ مجید

(انگریزی ترجمہ مع حواشی)

از :- عبد الحمید صدیقی

دوسرا پارہ چھپ کر بازار میں آگیا ہے۔

ہدیہ۔ ۱۲/۵۰ روپے۔ مستقل خریداروں کیلیے۔ ۱۰/- روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ اسلامک بک سنٹر۔ ۱۴ حبیب بنک بلڈنگ، چوک اُردو بازار پوسٹ بکس نمبر ۱۶۲۵ ۔ لاہور، پاکستان

۲۔ ادارہ ترجمان القرآن ۔ اچھرہ ۔ لاہور

ضروری اعلان

ادارہ ترجمان القرآن کے لیے لاہور میں سکونت رکھنے والے ایک اکاؤنٹنٹ کی ضرورت ہے جو اے جی آفس یا کسی اور محکمہ کے ریٹائرڈ شدہ ہوں، نیز کاروباری حساب کتاب سے بخوبی آگاہ ہوں۔ معاوضہ معقول دیا جائے گا۔

ناظم

ادارہ ترجمان القرآن ۔ اچھرہ ۔ لاہور